

خوبی خاموشی میں یا سین کی سانس کی آواز آرہی تھی جو میں تم سے چھ سال ٹڑپی ہوں؟ ” دُہ بولی۔ اسد نے اُس کے گال پر رکھا ہوا تھا آہتہ سے دبایا، اور دیر تک دبائے رکھا، حتیٰ کہ کلاف کے چھوٹے میں نہش پیدا ہرنے لگی۔

”تم،“ یا سین نے کہا، ”اس لیے تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا رہے ہے؟“

یہ کلخ نے کو اسد نے سوچا کہ شاید وہ بُلس رہی ہے۔ اُس نے نیم اذھیرے میں نظر پر زور دے کر دیکھا۔ یا سین کے ہونٹ پنکے پنکے سُوکھے ہوئے پھلوں کیا تند ایک دُسرے کے اوپر رکھے تھے اور اُس کی انکھوں میں اپنے سوال کی سوچ تھی۔ اسد کی سانس بو جھل ہونے لگی۔ دُہ اُنھوں کو بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دو ہین لمبے لمبے سانس کھینچ کر سینے کو صاف کیا۔ پھر اُس نے پہلو کے بل پڑی یا سین کو نچکے کی طرح بازوں کے حلقوں میں لے کر سینے کے ساتھ لگایا اور اُسی طرح بیٹھا عیشا بلنے لگا، جیسے ذلیلہ کر رہا ہو۔ یا سین کا بو جھل بدن اُس کے بازوں میں بے نزاہت پہنچا۔

جب دُہ رکا تو اُسے محروم ہوا تھا جیسے وہ کئی گھنٹوں تک لگاتار ٹھہرا رہا ہے۔ اُس کی کمر میں درد کے شرارے چھوڑ رہے تھے اور اُس کی سانس مشکل سے آرہی تھی۔ وہ یا سین کو بازوں میں لیے لیے بستر پر گرد پڑا۔ لیٹتے تھی وہ تھوڑی دیر کے لیے سر گیا۔ جب دُہ جا گا تو اُس کی سانس ہمارہ ہو چلی تھی۔ یا سین اُسی رُخ پر اُس کی چھاتی پگال رکھنے پڑی ہوئی بے صدم سانس لے رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی ایک تجھیں اسد کی پسلیوں پر بلاتی، انگلیوں کے پوروں کو ہر لے سے پسلیوں کے درمیان والی زرم چلد پڑاتی، پھر ساکت ہو جاتی، جیسے خبرِ خہر کو بے زبانی سے انگلیوں کے تار جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جگلوں میں اُس رات فرجتوں کے چھننے کی آواز بھی نہ تھی۔

رات کا پچلا پھر تھا جب اچانک بھلی کی کڈک کی ماں، سکوت کو چھرتی ہوئی ایک بُلبی، اکھنی پچھڑا کی آوازان کے کاؤں سے ہکھڑائی۔ — ہمیشہ کی طرح لا مقام، بے سمت، اور بہت قریب۔ اسد نے ٹرکر کھڑک کی جانب دیکھا، جیسے کھڑک میں شیر کا نہر دیکھنے کا موقع ہو۔ کھڑک میں صرف ستاروں بھرے آسمان کا نیم روشن جو کھٹا تھا۔ وہ دونوں کان لگا کر اُس آواز کی شکل کو ہوا میں غنٹے ٹکڑتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر دیر تک دم ساد جے اُس سے اچلی آواز کے منتظر رہے۔ مگر اُس آواز کا سلسلہ پیدا نہ ہوا، نہ کوئی دُسری آوازانی۔ دھنوں کی لاد کی ماں اُس ایک آواز کی لہر ہوا میں انٹھی اور مجھہ بُگھٹی، اور خاموش کھڑی اُن کے کاؤں میں سنتاتی رہی۔ آہستہ آہستہ اسد نے تر موڑا اور بستر پر پیدا ہائیٹ گیا۔ رات کے رعناء پر اُس آواز کا

نہ مٹا طاری تھا۔

و فعاً یا سین کا دھیلا بے جان حسیم ترپ کر بیدار ہوا۔ وہ کئی لمحوں تک گھسنوں پر کھڑی ہوا میں اُنگی ہوئی اُسد کو دیکھتی رہی، پھر وہ ہوا بھری چھتری کی مانند آہتہ سے اُس کے اوپر اُگری۔ اُسد کے ہدن کو اُس نے چاروں ہاتھوں پاؤں سے ڈھانپ لیا اور اُسے چڑھنے لگی۔ اُس کے سر کو، ماتھے کو، انھوں کو، ہونٹوں کو اور رخوں کو، اُس کے گردن کے خم میں، یعنی پہ، پسلیوں کی باریک چد کے اوپر، ناف کے اندر، گھسنوں اور ڈھنخوں کو چوتھی ہوئی دو پاؤں کے ٹھوٹوں پر چلی گئی۔

”یہرے پاس رہو۔“ وہ روکر بولی، ”اسدی۔“

اسد نے اُسے تھامنا چاہا مگر دو اُس کے ہاتھوں سے بچل گئی۔ اُس کے جسم میں غرّاتے ہوئے جائز کی سی تندی اور تغیری تھی۔

”اچھا۔ تمہارے پاس رہوں گا۔“ وہ اُسے سنبھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، چند روز کی بات ہے۔“

”چند روز میں آجائے گے ہے۔“ وہ اُسد کے کھنے پر دانت گڑتی ہوئی بولی، ”پھر یہیں رہو گے؟“ ہنسوں کے دوقطے سے اسہ کے گال پر گزے۔

”ہاں۔“ وہ برابر اُسے بازوؤں میں قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ تملکتی ہوئی اُسد کے سامنے بدن پر رکھتی رہی، جیسے پانی پر تیر رہی ہو۔

”اچھا۔“ وہ بولی، اور اُس کی گردن پر ہونٹ رکھ کر رونے لگی۔ اپنی ہاتھوں اور بازوؤں کے حلقوں میں اُس نے اُسد کا سارا جسم اس طرح کس لیا تھا جیسے اُسے اپنے بدن کا حصہ بنایا چاہتی ہو۔

صحیح کی خنک ہوا کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی۔ پہاڑ کے پہلو میں، گھاس کے اوپر، سوتے چاگتے میں اُسد نے دیکھا، ایک ہستا ہوا چہرہ ڈپا ہے جس کی آنکھیں بُناب یہیں۔ اور کھڑکی کے اندر ایک بندوق لٹکی ہے۔

(۲)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بِنْدَرٌ مِنْ آنْبَابِ الْقُ
بِنْدَرٌ مِنْ فَتَائِ
بِنْدَرٌ مِنْ بَيْتِوں کے کے کہ ہم
کوئی ان میں فتح نہ ہے اور کوئی

لِقَاءُ لِلْحَكْمَةِ

وَقَرْبَهُ مَنْجِدٌ
مَنْجِدٌ مَنْجِدٌ
مَنْجِدٌ مَنْجِدٌ

(۷۰۰: ۲)

(۷)

بزری مائل زنگت کے فوجی خیجے گھٹاڑپ درختوں میں پھیپھے ہوئے تھے
 تو جہاں تک نظر جاتی ان خیوں کا ایک شہر پا تھا۔ ساری زمین دپر سے
 نیچے پتھروں کو کوٹ کاٹ کر سیدھی سیدھی گڈنڈی نام سکریں بنا لگئی تھیں
 کے علامتی نشان لگھے تھے، کہیں گول دار، کہیں ضرب کا کراس، کہیں
 کھڑپوں کے لیے جگہ صاف کی گئی تھی۔ زیادہ تر جیپ اور ڈراج کا ریاں
 کی تریں نصب تھیں۔ دو قوپن کے اوپر فلکی ہیوں کے خول چڑھتے تھے، باقی
 گردے بزرگ کی نالیوں پر کہیں کہیں دھوپ کی شاخیں پڑپڑی تھیں
 ان پر اٹھتی نہ تھی، وہاں پر قی دہیں جذب ہو جاتی تھی۔ چند ایک جیپ
 ہوا تھا، اور ان کے اوپر سکے پکے پلک دار ایریلیں سیدھی سیاہ ہیں ہیں،
 جگل بیس میں طبوں، جالی سے ڈھکے ہوئے خود پہنئے، بول کئے تھے۔

کے، مگر اس دیسخ گھنے جنگل میں داخل ہوں
و بچھاڑ جھینکاڑ کو صاف کر دیا گیا تھا اور اپنے
میان شرکوں پر جگہ جگہ چونے سے مختلف قسم
کی جمع کا، وغیرہ۔ اکاڈمکا و ختوں کو کاٹ کر
تھیں جن میں سے کئی کے اوپر دریانے سائز
جنگلی اپنی سُزدیں اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کی
مگر ان کا رد عمل بے چک تھا اور وہ حرب
بکاریوں پر واڑ لیں کا ساز و سامان فٹ کیا
کی مانند اٹھتے تھے۔ زیادہ تر ذہنی جنگل کے
درالے سیاہ حل قوت سمجھتے ہوئے اصر

اُدھر آجاء رہے تھے، خیروں اور قوبِ گاڑیوں کے پاس کہا رہے تھے یا اُنہیں کی بیٹروں کے اُپر جگہ کے ہوئے تھے۔ کسی کسی جگہ پر پہاری پتھروں سے عارضی قسم کے کمرے بھی بنائے گئے تھے، جن کے اگے ایک سپاہی چھوٹی شیشیں گی کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا یا پتھروں کے دیسے چوکس انداز میں چل پھر رات تھا۔ کئی نہ رافت بلکہ پہاڑ کی اس ہمارہ چھٹی پر پائیں اور دیوار کا بظاہر ہے ضرر جگل اس بھاری سامان حرب کو ذھاپنے ہوئے ایک حصائی شکل تھا۔ ایک خیرخواہ کا پرودگرا تھا، پتھر کی گلڈنڈی سے ذرا ذور ایک ہبہ درخت کی اوث میں کھڑا تھا۔ ایسے کے اندر بتی جل رہی تھی، ایک طرف کو میز اور اُس کے اطراف دو گرسیاں پڑی تھیں جن پر اسد اور ذوالقدر آئنے والے منے میتھے تھے۔ خیکے کی دوسری دیوار پر ایک ٹیڑا سانقش لٹکا تھا۔ سامنے خیکے کی ٹکون میں ایک فوجی کاٹ رفت کی ہرل تھی جس کے اُپر کمبوں کا بست رکھا تھا۔ کھاث کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ میز پر ایک سرخ جلد والی ڈاری ناکتاب، ایک ماچس اور شیر بنانے کا سامان ٹپا تھا۔

خیکے کی دہنی دیوار پر، نیچتے کے پاس، ایک چھوٹا سا شیشہ لٹکا تھا کچھ دیر پہلے اسد جب خیکے میں داخل ہوا تھا تو کسی پہنچتے ہی شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر چونکہ ڈپا تھا، جیسے یہاں کی ایک موڑ مرنے پر کرنی مدم سامانوں حپڑے سامنے آ جاتے۔ اب ذوالقدر باتیں کرتے کرتے رک کر بے خیال سے جبی چاقو کے ساتھ پیسل کا سکتا باریک کر رہا تھا کہ اسد کو دوبارہ میشے میں وہ نسل نظر پڑی۔ اُس کے بال دیہاتی کشیروں کے انداز میں کئے تھے اور چار ہفتے کی دوڑھی بے ترمیس سے بڑھ کی تھی۔ اس دوران میں اگرچہ دو چار بار نہایا چکا تھا، مگر سر کے بال وحمنے کی ممانعت تھی، پھر اُس کے بال گملی سی چکنا ہٹلی لیے ہوئے چھوٹی چھوٹی سیوں میں ٹینا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے سر پر گندھی سی سفید کپڑے کی ٹوپی تھی جو شکل آؤ جسے سر کو ڈھانپ رہی تھی۔ شیشے سے نظر ہٹا کر اسد نے اپنے اوپر ایک لگاہ ڈالی۔ دو ایک بیسے سے میلے چڑھا کرتے اور بھاری شکوار میں ملبوس تھا اور اُس کے بے جا بپاؤں میں کشیروں ہیل تھی۔

”چار ہفتے میں تمہاری صحت ترمیک ہو گئی ہے؟“ ذوالقدر نے کہا، ”سانس کیسی ہے؟“

”ایک دورہ ہوا ہے۔ دھائی دن کا۔ اسد نے جواب دیا، ”سخت نہیں تھا۔“

”کوئی دورات کا پیدا نہ رہے پاپنچ سیرنگ لے کر؟“ ذوالقدر نے کہا، ”ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“

”اگر کچھ دن اور مکان چاہتے ہو تو“

”نہیں،“ اسد نے کہا، ”ٹھیک ہے؟“

ذوالفقار نے اچانک اتحاد کیا۔ اُس نے ہاتھوں میر پر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اسد کی ہاتھیں کلانی کو اپنے سامنے کھینچ کر اُسے دیکھنے لگا۔

”یہ نہیں چلے گا“ وہ کلانی کو انگلی سے خوبک کر بولا، جہاں گھری باندھنے کی وجہ سے جلد پہنچے زنگ کا مستقل نقصے کا نشان دن گیا تھا۔

”آستین کے نیچے آجائے گا۔“ اسد نے کہا۔

”اوہ ہوں“ ذوالفقار نے فیصلہ کیا انداز میں سر ملا یا، ”رسک ہے“ پھر اُس نے منہ اٹھا کر آواز لگائی؛ ”علی!“

خیسے کا پردہ اٹھا اور ایکس پاہی نے اندر داخل ہو کر سلوٹ مارا۔

”مگل شیر کو سمجھو“

پاہی دوبارہ سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار نے اسد کی کلانی پر سے اتحاد اٹھا کر کڑی نظر وہ سے دیکھا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”ہنہہ؟“

”اپنے ہام کی آواز پر کوئی جوابی حرکت تمہاری طرف سے نہیں ہوئی“

”آواز پاہی کو پڑھی تھی۔“

”یہ نے جب آواز دی تھی تو تمہاری طرف دیکھ دیا تھا۔“ ذوالفقار میری سے بولا۔

”مجھے علم تھا کہ مخالف ہیں نہیں ہوں۔“

”رنیکیس۔ مانی فرینڈ۔ رنیکیس۔ چار بنتے تھے تمہیں رنیکیس کی پیپ میں کیوں رکھا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ تمہارے رنیکیس دو میپ ہوں۔ رنیکیس۔“ وہ نمرودے کر بولا، ”ایک انھل کی جیکس سے تم اپنے لذذناش کر سکتے ہو۔ انھلیں جس سبب رنیکیس نکا کھیل ہے، اور انٹنکٹ کا۔ اس میں کوئی قانون نہیں، یا یہ کہ اس کے پنے قانون ہیں جنگل کے جاذر کو تیجھے سڑک دیکھے بغیر خبر بر جاتی ہے کہ اس کا تعاب کیا جا رہا ہے۔ تم نے بھی دیکھا ہے وہ ایک پتا گر نے کی آواز سے بدک اٹھتا ہے، حالانکہ اُسے علم ہوتا ہے کہ محض ایک پتا گرا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اگر سوبار میں ایک بار بھی چوک کیا تو جان گزابی ہے گا۔ اس کام میں کوئی رسک کو زندہ نہیں ہوتا۔ موقع عمل کے مطابق خود اپنا عمل وضع کرنا پڑتا ہے۔ کوئی حیلہ بہاذ کام نہیں دیتا۔“

”یہی نے کوئی حیدر پہنچا نہیں کیا؟“

ذوالفقار نے پاتھر اٹھا کر اسے صبر کی طبقیں کی۔ ”بیری تاکو خلوات بھجو، میں تمہیں الزام نہیں دے رہا بھض اٹھیں جس کا فلسفہ پتارنا ہو۔ اب تم دنیکے واسطے ایک شخص بنہم علی ہو۔ آج سے تمہارے اور پرعلیٰ مراد دلد شہیاز قوم اجاڑ سکنے تو پہاڑ پیشہ مزدور کی ذاتی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ تمام ترافلقی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ آج ستم نے علمداً اپنی ذات کی ایک شکل تخلیق کی ہے اور اس فیصلے کے ذمہ دار ہو۔ مدد سے، توہین سے، آگے بھکا اور اسد کے دونوں کندھوں پر پاتھر کھکھل بے سے بولا، ”یو ار لے یہیں“۔

اس کا جذبہ اور جوش اسد کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خالی خال اُنکھیں کھولے ذوالفقار کو دیکھتا رہا۔ اسی آشاد میں خیسے کا پروہ اٹھا کر لیک حوالدار انہر آیا اور سلوٹ کر کے انتظار کرنے لگا۔ ذوالفقار نے اس کی طرف دیکھ جو بغیر پاتھر اٹھا کر سلوٹ کا جواب دیا اور اسد سے مخاطب رہا۔

”کیس پر کی ٹریننگ سے پوری طرح مطمئن ہو ہو؟“

”ہاں۔“

”پاتھر ناں نہیں۔ ان ارد کا بیٹ۔ نیپ پیڈنگ۔ ماں سفر“

”ہاں سب۔“

”یہ سب چیزیں حفظ مانقدم کے طور پر کھنچی ضروری ہیں۔ مگر کامیاب اٹھیں جس اور پریشان وہ بتا چہ جس میں کا بیٹ دخیروں کی ضرورت ہی نہ ہے۔ بھوت کی طرح چاروں کوڑوں میں پھر جاؤ اور ٹکن کی ہرا کو خبر نہ ہو۔“

ذوالفقار نے حوالدار گل شیر کی طرف دیکھ کر اسد کی کھلائی کی جانب اشارہ کیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اسد کی کھلائی اتھر میں لی، اور جلد کی اُجلی پیٹی پر اُنگلی پھیر کر بولا:

”یہ تو نیپ سے کوئی ہوگی، سر۔“

”مچیک بھائی ہو جائے گی؟“

”بالکل، سر۔“

”آج جی ہو جائی چاہیے۔“

”آج جی ہو جائے گی، صاحب۔“

”زیادہ ذجول جائے۔ خیال رکھا۔“

”پسا بھی نہیں پہلے گا، صاحب۔“

”مٹپیک ہے، گل شیر“

”لیکن سحر“

حوالدار سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالغفار انہوں کر سانے لگئے ہوئے تھے کہ آگے جا کھڑا ہوا جس کے اور چمچ جبکہ زنگ دار گتے کے مختلف شکلوں کے مکرے پر چپا تھے۔

”میپ سان؟“ وہ انگلی اٹھا اٹھا کر لفٹے پر رکھتا ہوا بولا، ”آدم۔ ایک آپس اڑکری۔ سپاٹر لفٹری۔ سائز۔ سٹرینگیٹر۔ آج کل، اُس نے دو متوازنی سترکھروں کے اوپر اور پر انگلی دوڑاتے ہوئے کہا،“ یہ سب کا پیدا ہمارے استعمال میں ہے۔ اسی سے تم جاؤ گے۔ اس بارے میں اٹھی جنس ہماری اپنی یعنی آرمی کی ہے اور اپنے ٹوڈیٹ ہے۔ ہمارے کارپیڈر کو وہ ماں کرتے رہتے ہیں، مگر ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر خبر ہو جاتی ہے۔ لکر کی کوئی اسٹنیں۔ کل رات کو تھماری رو انگلی ہے۔ جائے سے یہلے پہر حال ایک بار.....“

کر شش کے باوجود اس کی باقی پاپا ذہن مرکوز نہ رکھ سکا۔ پنج بیت رہا جی کی شکست متوازی لکھیں
بھی ہر قلی ہر قلی دوڑ تک پلی گئیں، اور ان کے پنج بیت پچ نمک کے بڑے بڑے مکانی تو دے اجھڑنا شروع ہوتے۔
دیکھتے ہی دیکھتے وہ تو دے پکھنا شروع ہو گئے، جیسے برف کے تو دے ہوں۔ ایک بار اس کے ذہن میں
ایک شعبد سا بھرنا تھا، اسد نے یاد کیا، جس کی تو میں ایک لمبے کے لیے ذوالغفار کا چڑہ بھے راز بھر کر سامنے آ
گیا تھا، پھر کھو گیا۔ یہ راز کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ نمک کے تو دے میں ایک گہرا باریک سوراخ ہے جس میں
کوئی الگ بھری ہے.....

★ ★ ★ ★ ★

"بائٹرچپڈ" اس نے کشیر روں کے انداز میں کالی دھی۔ انہی سے میں اُس کا پاؤں سنکریوں کی دھلان پر پھسل گیا تھا۔ بیشکل توازن نہ دام رکھتے ہوئے وہ دو گز نیچے جا کر پاؤں کے بل میجھ گیا۔ چند ذک دار کنکریاں اُس کے

چورڑوں میں ٹھس گئی تھیں۔ اُس نے اختیار سے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ شکار کے اندر نرم چوب وار گوشت میں جہاں
لکنکر بائیں چھپی تھیں تھے گڑھے پڑ گئے تھے، جو اختیار سے مٹھے پر رفیع ہو گئے۔ اُس نے دبا دبا کر دیکھا۔ چورڑا
خشک تھے، خون نہیں بیکلا تھا۔

نمک کا ڈالا اُس کے کندھے سے گود میں آگرا تھا۔ اسد نے پھر زیر لسب گالی دی۔

”یہ بھی ایک مصیبت ہے، ”وہ نیچی آواز میں بولا، ”اسے پھینک دوں ۔“

”اوہوں۔“ امیر خاں نے ڈراس اسر بلایا۔

”اب اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اب ہی تو ضرورت ہے۔ ابھی ہم نے کاپیدور بھی پاس نہیں کیا۔ جو جہہ چکنگ کا خطرہ ہے۔ ادھر
کوئی آنے والا نمک کے بغیر نہیں آتا۔ اس طرف تو یہ سونا ہے سزا ملے مزمل نمک سے جانا ہے۔“

اسد نمک کو بازوں میں لے کر آنکھ کھڑا ہوا۔ ”سر پر نہیں آٹھا سکتا ہے۔“

”اوہوں۔“ امیر خاں نے دوبارہ ڈراس اسر لفی میں بلایا۔ ”کوئی کشیری سر پر بوجھ نہیں آٹھاتا، جو سر پر کھا
آٹھا کے دکھانی دے سکھو لو جمتوں یا پونچھو کا ڈوگری ہے۔ یا تو یہ کا ہے۔ ہل کشیری پیچھے پر بوجھ آٹھاتا ہے اور کر کے
زور پر چڑھانی چڑھتا ہے۔“

”کیوں؟“

”کشیریوں کا قول ہے کہ سر پر بوجھ آٹھا نام خور توں کا کام ہے۔ مرد کا نسرا آزاد ہوتا ہے اور اُس کے کندھوں
پر دنیا کا بوجھ ہوتا ہے۔“

”بھیب پہلوہ روایج ہے۔“ اسد نے کہا۔

”بھیست اڑاؤ۔ بھیب ہے، ڈرے ڈرے سمجھا در قسمت کے نیچے گنگ جاتے ہیں۔ اس وقت جہاں
حالت اچھی نہیں، مگر بھی نکبھی بھیب ہو کر رہے گی۔ عقیدے ہیں بُری طاقت ہے۔ اس کے زور پر ہم نے اپنا سر
آزاد رکھا ہے۔“

اسد کو بے ختیار نہیں آئی، اگر وہ ڈک گیا۔ عین وقت پر اُس سے احسکس ہوا کہ امیر خاں پوری سنجیدگی سے بات کر رہا
ہے۔ اُس نے دل میں لشکر ادا کیا کہ انہیں میں امیر خاں نے اُس کی بُرسی نہیں دیکھی۔ امیر خاں مانما جواہر جو پار کرنے
والا تھا۔ چھوڑ فرش کے نقشے میں پیش سے ایک نقطہ رکا دو، روایہ ہونے سے قبل اُس نے دُنیگ کے ماری تھی، میں چل کر
تمہیں اُس نقطے پر جاؤں گا۔ اسد کو اُس پر مکمل اعتماد تھا۔ آنکھ بُرا فرش کی میڈی پر اس درے کو مقابل راستے سے

اُنہوں نے یوں عبور کیا تھا جیسے جزیلی سڑک ہو۔ ان کو چلتے ہوتے سات آٹھ گھنٹے ہو چلے تھے۔

”میری ہدی میں چھپ رہا ہے۔“ اسد نے چادر کی پُرٹی بناؤ کر سر پر جائی اور ناک کا دھیلا اُس پر رکھ لیا۔ جب کوئی آیا تو کندھے پر رکھ دیں گا۔“

”تھا را خال ہے تھیں تباکر آئے گا ہے۔“ امیر خاں نے کہا۔

”تم کشمیری ہو ہے۔“

”صل کشمیری۔ ہم لوگ صحا بیوں کی اولاد میں سے ہیں۔“

”صل کشمیری تو براہمی ہیں۔“ اسد شہزادت سے بولا۔

”ہمارے ہی بھائی نہ رکھتے۔“ دُو حقارت سے بولا، آریہ سما جیوں نے پکڑ کر براہمی نبادیے۔“

”ہم درستے سے تو بخل آئے ہوں گے۔“

”اں۔“ امیر خاں نے کہا۔

”وہم لینے کے لیے خبر نہیں سکتے ہے۔“

”اوہنہوں۔ اب تو ہم مائون کے علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔“

”بیرا جہاں تھا ہم مائون کے علاقے سے پس کر چل رہے ہیں۔“

”ماں آں!“ امیر خاں نے طنز بھری آواز بھاول، ”پس کر چذا تھا تو گھر میں بیٹھے رہتے، باہر نکلنے کیا ضرورت تھی۔ اب اللہ ناک ہے۔ میرے یہ چھپے یہ چھپے چلتے آؤ۔“

راتستے کے کنارے پر ایک بار بھر اسد کا پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ جب سے وہ چلتے تھے وہ دو مرتبہ بُری طرح پھسل چکا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ لگرانی کو سجنی دیکھنے سکتا تھا، مگر اُسے علم تھا کہ وہ کئی سورج گھری کھافی کے کنارے پر جا کر رکا ہے۔ اب وہ جس علاقے میں جا رہے تھے وہاں دو طرفہ پہاڑ، جو رات بھر سبب ہاتھیوں کی ہاندہ جھوٹتھے رہے تھے، کھلنے شروع ہو گئے تھے۔ دو رہنٹے بننے سے وہ مدھم سی سیاہ دیواروں کی شکل اختیار کر گئے اور آسمان کو کھلتی ہوئی اُن کی چوڑیوں کی تند لکیر تاریکی میں تھیں ہونے لگی تھی۔ اب اس گجد گھٹے آسمان کے ستاروں کی نوجھی اور زمین کی ایک شکل بھروسہ ہی تھی۔ مگر ابھی ناک دہ دنوں آدمی پہاڑ کے پیٹ پر کامیٹے ہوئے ہوئے ہوئے کیجاۓ اس کے پہلو میں، چنان کے آگے اور یہ چھپے، بھروسہ بُریوں اور چرداہوں کی بنائی ہوئی تینگ، بے نشان مگنڈیوں پر سفر کر رہے تھے۔ پسکھلے ایک گھنٹے سے وہ سلسل اڑائی میں چلے جا رہے تھے۔

”اب ہم اور پر نہیں جاسکتے ہے“ اسد نے راستے کی طرف اشارہ کر کے پڑھا۔

”اوہ بھروس۔ وہ چیز کا چانٹھ دیکھ رہے ہو ہے“ امیر خاں نے سرگوشی میں جواب دیا، ”دہاں سے دہاں تک۔“ پیچھے دہاں اور پر تک — ایک بڑی گینہ فوج پڑھی ہے اس میں“

اسد کا بدن لئے بھر میں جم گیا۔ خطرے کو اس قدر قریب پا کر اُس کی چال میں خود بخود ایک واضح تسلیلی آگئی۔ اُس نے تک کا دھیلا سر سے اُنہار کر کندھے پر رکھ لیا اور پھر چاہا جا کر، بلکہ پچھلے بے اواز انداز میں تدم رکھنے لگا۔ خطرے کا یہ احساس نیا تھا۔ اس سے دہ پہلی بار شناسا ہوا تھا۔ پر اسیں کی سپروگی میں، حوالات کے اندر جس خطرے سے اُس کا سامنا ہوا تھا اس خطرے میں دہشت تھی، اور گلا گھنٹے والی کافت کا احساس تھا۔ اس خطرے میں دہشت تھی، یہ خطوطِ مہل اور سنگین تھا، اس میں جسم کا قبول تھا اور سرکشی تھی اور کوئی بیسر پھر نہ تھا، جان داؤ ہے تھی۔

”تک گئے ہو ہے“ امیر خاں نے سرگوشی کی۔

اسد جواب دیے بغیر تیز تیز اُس کے پیچھے چلتا رہا۔

”اُڑائی مشکل ہوتی ہے“ امیر خاں نے کہا، ”چڑھائی میں پچھے کام کرتے ہیں۔ دم لے دو تو سہل جاتے ہیں۔ اُڑائی میں رگوں پر زور پڑتا ہے، اکڑ جاتی ہیں۔ اُڑائی مرگ رہی ٹہدوں کا کام ہے، زور نہیں کھاتیں حکیم سے تم نے کچھ حکمت سیکھی ہے ہے؟“

”نہیں۔ تم حکیم کو جانتے ہو ہے؟“

”واہ۔ اس علاقے میں کون حکیم کو نہیں جانتا۔ اُس کے لوگوں پر بڑے احسان ہیں۔ یہ علاقہ ہی احسان فراہوش ہے۔ درد نہ یہ لوگ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہے؟“

”فھرئے اسد لوز کراپتے پیر دل پر رک گیا۔ امیر خاں نے اُسے رُکنے ہوئے محسوس کر کے پیچھے دیکھا۔“

”کیا ہے؟“

”وہ دیکھو؟“ اسد نے سرگوشی کی، ”وہ اے؟“

”کہاں؟“

”وہ سامنے۔ وہ ختوں میں۔“

امیر خاں نے ایک نظر اور صردالی اور پچھے سے ہنسا : ”انکھیں ہیں؛“

”انکھیں؟“

”جانور کی۔“

”کس کی؟ شیر کی ہے۔ اس نے بے سرچے سمجھے پوچھا۔

”گیدڑ ہو گا۔ شیر ادھر کہاں۔ اُدھر ہماری طرف ایک بھولا ہوا آگیا ہے۔ کوئی باگہ ہے سمجھنے کم جیسا راجائے گا۔ یہ علاقہ شیر دیکھنا نہیں چلے گا۔“

اسد کے دل میں خوف کا انہیں اگبر اگبر ہو گیا۔ اُس نے نک کا ڈھینلا پھر انہا کو سر پر لکھا اور کم جی کم جی ٹانگوں سے ایک خاں کے تیچھے چل پڑا۔

”تمہاری قسمت اچھی ہے۔ اس کا ریڈور کے اندر سے یہ چھوڑا رستہ جاتا ہے۔ پچھلے ہمینے جس طرف سے جانپڑتا تھا اُدھر پیر رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ اب بار دو ہی سرخیں بھی جل گئی ہیں۔ پہلے کیل والی ہوتی تھیں، پاول گھیٹ کر چلتے سے پہنچ جاتے تھے۔ اب تھی اگئی ہیں پتوں اور ڈھینلوں کی شکل والی۔ پتا بھی نہیں چلتا۔“

”چپ رہو۔“ اس نے کہا، ”کوئی سن لے گا۔“ خدا کے لیے چپ رہو، اُس نے دل میں کہا۔

”میری آواز ہے میری آواز ایک نشے سے آگے نہیں جاتی۔ مجھے بولنے کا تمہرو ہے۔ تم نہ بولو۔ تمہاری آواز دُور ہاتھی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔ نہیں مانیں نہ کروں تو میرا سفر نہیں کہتا۔“

میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اس نے سرچا۔ اس نے بولنا نہ کیا تو میں نک کا ڈھینلا اس کے سر پر دے مار دیں گا۔ آزاد سر کا تجھ پوری رات بکل گئی ہے، بک بک بک بک۔ تھوڑی دیر اور چلتے رہے تو میری ٹانگیں جراپ دے جائیں گی۔ یہ رات کب ختم ہوگی؟

..... آج تک اندھے فضل سے میرے راستے میں کوئی ایک یہ نشہ نہیں ہوا۔ سب وہ سوں کے ہوئے ہیں، کسی کا ایک، کسی کے دو، فیکٹے اُڑ جاتے ہیں، یا پکڑے جاتے ہیں۔ میرا ریکارڈ ہے۔ کمھن میں سے بال کی طرح بکل جاتا ہوں۔ تم تھک گئے ہو ہیں میں سمجھتا ہوں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا سانس بھی غرائب ہے۔ کوئی بات نہیں، رات رات کا سفر میں آج کا ہے، آگے کھلا علاقہ آجائے گا، خطرو بھی کم ہو دے گا۔ بل ہر دن میں چلیں گے۔ بل دوپہر کو بکل پڑے تو شام تک پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنی بُری بھی تلاش کی ہے، تمہیں کچھ خبر ہے کہاں ملتی ہے؟ خیر یہ تمہاری اپنی مصیبت ہے، مجھے کوئی مطلب نہیں۔ تمہیں کافی وقت مل جائے گا۔ مخبری میں ہر ہی مخبری میں وقت ہی وقت ہوتا ہے، خطرو بھی کوئی نہیں جیکیم ہے۔ میں نے ایک بار دوایں تھی، میری ایروں میں دو احتمال تھا۔ مجھے تو افادہ ہو گیا تھا۔ خیر.....“

اس کی مدد، (مختصر قظر والی!)، باٹوں آواز اسد کے کانوں میں آتی رہی حتی کہ اس نے تنہا چھوڑ دیا اور

شدید تنکان کے باعث خطرے میں گھرے ہوئے کا اندیشہ اس کے دل سے اتر گیا۔ مگر جب صبح کا ذب کی روگنی اور امیر خاں بات کرنے کرتے ہوئے مڑا تو اسدیہ دیکھ کر چیزان رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں وحشت کا خلا رہتا اور طویل خود کے مارے اس کا پھرہ پھر پھکا تھا۔

کھلے علاقے میں داخل ہوتے ہی امیر خاں چبے ہو گیا اور اس کے چہرے پر خون کی رنگ ظاہر ہوئی۔ اجالہ ہوتے ہوتے وہ اپنے پہلے ٹراوہ پر جا پہنچے۔ یہ ایک بیٹھنے سے پہلے ہوئے ہیلے کی ڈھلانوں پر بنا ہوا پچھا ساٹھ گھروں کا گاؤں تھا۔ صبح سورپرے انہوں نے ایک دروازے پر جا کر دستک دی۔ بڑی بڑی ڈھلنی تھیں مونچھوں اور منڈے ہوئے سر والے ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ امیر خاں کو پہچان کر اس نے خاموشی سے سر ملا یا اور دستہ پھوٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہرگئے تو اس آدمی نے ایک لمحے کر سر باہر نکال کر دیں اور یامنی نظر ڈالی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

ان دونوں سافروں کا کام یہاں صرف سنتا نے اور کچھ کھانے پینے کا سامان کرنے کا تھا۔ اسد کو معلوم ہوا کہ جیسے گھر کے مالک کو ان کی آمد کے مقصد کی عین نوعیت کا علم تھا اور وہ اسے دیہن تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں اسے پشاچلا کہ اس کام میں ہر شخص کو دوسروں کے کام کے علاوہ خرد اپنے کام کی نوعیت کا بھی علم ہوتا ہے اور ہر کوئی کو ضرور نہ اس میں ملوٹ ہوتا ہے تاکہ شو قیہ، اسے دیہن تک محدود رکھنا چاہتا ہے، کمرے میں داخل ہو کر فرش پر بیٹھتے ہی اسد نے پہلی مرتبہ بدن کو ڈھیلا پھوڑا، اور گریا پہلی ہی بار پہنچے مردا کر دیکھنا ذکر کیا۔ بیٹھنے سے پہلے امیر خاں نے اتنے سے اسد کی جانب اشارہ کر کے مونچھوں والے سے کہا: "علی،" مونچھوں والے نے اس کی طرف دیکھے بغیر رضا مندی سے سر ملا یا۔

گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ ایک دیوار میں مٹی کارکھے بھرا چوہا سرداڑا تھا۔ چوہے کے ہر گئے نصف دائرے میں زینہ پر زینہ پچھے پڑے تھے۔ دو چھوٹے پچھے ابھی محروم تھے جب کہ فو دس سال کی ایک بچی سنکھیں کھلے چلتی رہی تھیں۔ ایک طرف اوچیر غیر کی ایک عورت بیٹھی بھاری ڈندے کے ساتھ پھر کی دوری میں آہستہ آہستہ پکھ کر رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک کھاث پڑی تھی جس کی ادوائی لوت کر پچھے لکھ رہی تھی۔ کھاث پر میسلے میسلے پھٹے ہوئے لمحات اور کئی دوسرے کپڑے ڈھیر کی شکل میں پڑے تھے۔ دو دس سال کی بچی اٹھ کر بیٹھ گئی اور ملکھلی لگا کر اسد کو دیکھنے لگی۔ پچھے کل طبع عورت بھی ملکھلی بامدھے نک کے ڈھیلوں کو بخنتے ہوئے اتنے سے دوری میں ڈندرا چلائے چاہی تھی۔

"دوائی سے تمہیں آرام آگیا تھا؟" اسد نے گفتگو کرنے کی سعی کی۔ بدن ڈھیلا پھوڑ کر اسے آرام محسوس ہو۔

رہا تھا۔

”بہت افادہ ہوا تھا، کئی مہینوں کے بعد ایک ایسا میں دوبارہ درد آٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر دوسرا میں اس کے بعد نہیں ہوا، بالکل جاتا راستہ کم کی دوا کار آمد ہوتی تھی۔ یہ تو انہیں بُولی بات ہے یہ“

”اب بھی ہوتا ہے یہ“

”نہیں ہے یہ“

”دوسری ایسا میں ہے یہ“

”لماں ہے یہ“

”ہر وقت ہے یہ“

”نہیں۔ ہر وقت تو پچھلے بھی نہیں ہوتا تھا۔ سروی کے دنوں میں ہوتا ہے یہ“

”دوبارہ درد آٹھا تو تم نے دوالی تھی یہ“

”ادنہیں۔ فرصت ہی نہیں مل پچھ سستی بھی کر گیا۔“ ایسا خان جنسا۔ ”صل میں جب درد بالکل جاتا رہا تو پچھے پچھے عجیب سامنہ معلوم ہرنے لگا۔“

”کہے یہ“

”چلنے میں تخلیف ہونے لگی۔ آئی دیر سے میری ایڑیوں میں درد تھا کہ میں ایڑیاں آٹھا کر چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ جب درد جاتا رہا تو میں پُرا پاؤں دبا کر چلتے رہا۔ اس سے پاؤں آٹھا پڑنے لگا۔ میرے شکنے بھی درد کرنے لگے۔ جب ایک ایسا میں درد آٹھا تو میں نے شکر کیا۔ جب درد کا اور میرا ساتھ ہی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے یہ“ وہ پھر خداک سی نہیں بنا۔

گھر کے ہاک نے لمبی سی قیمت کے اپر رملی بھری ہری غیرہن کی داکٹر پہن لی تھی۔ اس نے دنوں بہانوں کے آگے بھی کی روشنی، میوے والا گڑ اور تھوڑا سا ترش دہی لا کر رکھا اور خود جا کر اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ سب سے پھرنا بچہ جاگ کر رونے لگا تھا۔ اسد اور ایسا خان نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ کھانے کے بعد دنوں نے اپنے اپنے نک کے دھیلوں پر چادروں کی پکڑیاں بنایا کر رکھیں اور سونے کی یہ زمین پر لیٹ گئے۔ اسد کے دل میں کھد بندگی تھی۔ یہ شخص میرے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے یہ اس علاقے کا ہے۔ انگلی جنس کا ادمی ہے۔ سب کچھ جانتا ہو گا۔ پھر یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا ہے اور اس کی طرف داری کیوں کر رہا ہے؟

”تم خوشی محمد کو جانتے ہو ہے اس نے پوچھا۔

”ماں۔ ہمارے ساتھ رہا ہے۔“

”کہاں ہے؟“

”یہیں۔ ادھر کام کرتا تھا۔ پہلے پہل بُت اچھا رہا۔ پھر دنادے گیا۔ بدنجست۔“

”یکسے ہے؟“

”ڈبل ہو گیا۔“

اسکی آنکھیں بعد ہوتے ہوتے کھل گئیں۔

”اس بات کا پتا کب چلا تھا؟“

”سلسلہ بات کا ہے۔“

”کہ ڈبل ہو گیا ہے۔“

”پچھلے دنوں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”مُنہہرہ۔“

”اس نے حکیم کو فمل کیا ہے؟“

ہیرخان کی آنکھیں اب نہ ہو چکی تھیں۔ پسح پوچھتے ہو تو فمل و قتل کرنے کی اُس کی جان نہیں تھی۔ چڑھی کی پٹک سے کاپ جانا تھا۔ جنگل مزدور تھا، میں اُسے اپنی طرح سے جانتا ہوں۔ علاقوں کا واقع تھا، روئی کرنے کی خاطر اس کام میں آگیا۔ مگر یہ بُخت تھا۔ زیادہ لاپسح میں پڑ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے صرار کیا۔

”خیال کیا ہو گا۔ تمہارے اور پرچی شک کیا گیا تھا، مجھے علم ہے۔ مگر پسح پر چھوڑ ایک آدمی کی جان لینا تمہارے بھی بس کی بلت نہیں۔ مجھے آدمیوں کا تجربہ ہے۔ میں دیکھ کر آدمی کی خصلت پتا میریسا ہوں۔“

”پھر خوشی محمد کوڑا کیوں گیا ہے؟“

”وانندھا علم کرنے کوئی ثبوت ہرگاں پر لیں کے پاس۔“

”ثبوت کا کیا ہے؟“ اس نے کہا، ”ہمیا کیا جائے کرتا ہے۔“

”بس۔ اور کیا چاہیے؟“

”کیوں۔ اور کچھ نہیں چاہیے؟“
 ”بھائی۔“ امیر خاں نے انکھیں کھول کر صبر سے کہا، ”اس طرح بحث کرنے لگئے تو کہو گے کہ جرم بھی مہما
 کیا جا سکتا ہے۔ یہیک ہے، اس دنیا میں کیا کچھ نہیں مہما کیا جا سکتا۔ حقیقت کا علم صرف خدا کی ذات کے ہے۔
 نہیں سمجھتا ہوں پھر بھی خوشی اچھارا ہے، قید میں جا کر محفوظ ہو گیا ہے۔ ورنہ دبل کو ملکانے والگانہ کوئی شکل بات
 نہیں۔ اب آرام کرو۔ زیادہ سوچ والی باتیں کرو گے تو نیند اڑ جائے گی۔ میری نیند بھی خراب کرو گے۔ دوچھٹنے
 آرام کرو۔ جتنی دیر سے چلے آتی دیر میں پہنچیں گے۔ ذات ہو جائے گی۔“

اس چوتیں میں انکھیں کھولے چھپت کر تکتا رہا۔ ایک ہی منٹ کے اندر امیر خاں کامنہ کھل گیا اور اس کا
 اوہ گنجابر نہیں تھک کے ڈھیلنے سے آہستہ آہستہ رُخنا شروع ہوا۔ اس نے چونکہ انکھیں کھول دیں، سر کو
 ہوا میں انھائے خالی نظروں سے اسد کو دیکھا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر کروٹ لے کر، سر کو
 اپھی طرح سے چلور کی گپڑی پر جا کر سو گیا۔

اس نے بھی کردٹ لی اور بازو کو سراور چادر کے تیکے کے درمیان رکھ کر انکھیں نہ کر لیں۔ علامزادے
 اس نے دل میں کہا۔

شم تک وہ پہنچ جائیں گے، اس نے سوچا۔ پھر شلوار اُڑ رکا کہ اس کی شناخت کی جائے گی۔ اس
 بارے میں ذوالقدر اسے پہلے ہی بتاچکا تھا جو چند باتیں اسد کو مستغل پریشان کیجئے جوئے تھیں ان میں ایک
 بہت بھی تھی جب سے ذوالقدر نے اس کا ذکر کیا تھا، بار بار اسد کو اس کا خیال آثارا تھا۔ اکثر اس کو رات کے
 وقت انہیں بیٹھا کر رکھا تھا، اور متعدد بار اس نے اپنے ذہن کی انکھیں اسے ہوتے ہوئے دیکھنے کی
 کوشش بھی کی تھی، مگر بے سود۔ زیادہ سے زیادہ اسے حوالات میں اپنے لئے بدن کی بادا آجائی۔ مگر اس میں
 وہ بات نہ تھی۔ حوالات والی شکل میں سارے بدن کا وجود اور اس بدن کی دہشت شامل تھی۔ مگر اس بات میں کوئی
 دہشت نہ تھی۔ اس میں بدن محفوظ تھا، صرف بدن کی دریافت کا ایک نہایت سختیہ اور کسی قدر مضبوط خیر کھیل
 تھا جو اس میں چھیک پیدا کر تھا۔ رفتہ رفتہ یہ چھیک بڑھ کر اس کے ذہن میں ایک ترد کی شکل اختیار کر
 گئی۔ ایک بار بھت کر کے اس نے ذوالقدر سے اس کا فکر بھی کیا:

”اور تو سب صحیک ہے۔“ اس نے کوشش کر کے ہم سے لپھے میں بات شروع کی، ”صرف یہ شناخت...“

”شناخت کیا ہے؟“

”اسے کسی میری تھیس سے ملا نہیں جا سکتا ہے۔“

ذوالفتار نے پائے ہونٹ ذرا سے سکیرے، جیسے ایک عجیب سی سکراہت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”نہیں۔“ وہ سمجھدیگی سے بولا، ”یہ بات تمہیں خیز معمولی سی معلوم ہوگی۔ مگر آج کل کرنی ہی بات غیر معمولی نہیں۔ ان مخصوص حالات میں ہمارے پاس یہی ایک طریقہ اپنی آئندہ نعمتی شہادت کرنے کا رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی فل پر د فریقہ نہیں، مگر آئندہ نعمتی شہادت کرنے کا آج تک کوئی فول پر د فریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ عام حالات میں گواہیوں سے کام چل جاتا ہے۔ مگر آج کل گواہوں کا کیا اعتبار ہے ان حالات میں اپنے آپ کو ننگا کرنے سے کم کام نہیں جلتا۔“ وہ اچانک نیم شہادت سے اسد کو دیکھو کر سکرا یا، ”شرم کی کیا بات ہے۔ جوان ادمی ہو۔ مردوں کے سب کیلئے بن بھی ہوا کہ تے ہیں ۔۔۔۔۔“

اس کے بعد اسد نے اسے ذہنی طور پر قبل کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے تردید کا بوجھ اُس کے دل سے نہ گیا۔ آخر یہ بوجھ اتنا بڑھا کہ اُس نے سوتے ہیں اس کی شکلیں دیکھنا شروع کر دیں۔ پچھلے چند روز میں وہ دو تین بار خواب دیکھو چکا تھا۔ کبھی وہ سرحد کے اور پھر اہرنا (سرحد، نہیں پر ایک سیدھی لکیر کی شکل میں پہنچی) ہوتی، اور وہ ایک پاؤں لکیر کے ادھر اور دوسرا ادھر رکھنے کھڑا ہوتا (اور اس کی نانگیں اور پیرنگے ہوتے، شدوار کمیں غائب ہوتی، اور منفرد مسلح سپاہی اُس کا کرڑا اٹھا کر رہا ہے۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ وہ اسی طرح نانگیں چڑھی کیے سرحد کی لکیر کے اور پار کھڑا ہے اور ایک سرپھوں والا سپاہی تجھک کر بخوبی اُس کے آٹھ تسل کا ملاحظہ کر رہا ہے۔ سپاہی کی سرپھوں اچانک لمبی ہوئی شروع ہو جاتی ہیں جس کی اک اُس کی رانی میں جس سے اُسے چلد پر کھلی حسرہ ہونے لگتی ہے۔ سپاہی اتحاد بڑھا کر اس سرگوشش کے وظہر کے کو اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں کپڑا لیتا ہے اور دبا دبا کر دیکھتا ہے، پھر پھوڑ دیتا ہے اور کھڑے ہو کر اطمینان سے سر ٹلاتا ہے۔ پھر یہ ایک آٹھ تسل بدن سے جھدا ہو کر نہیں پر گہرا ہا ہے، چھے سپاہی اپنی بیٹی ہیں ہو کر اور پر اٹھا لیتا ہے۔ ان کے گرد چند لوگوں کا مجمع ہو گیا ہے اور سپاہی بار بار ہمی ملا خلے کے لیے ہر ایک کے آگے جنیٹ لگی رانفل گھما رہا ہے۔ مجھے میں چند ماؤں چہرے ہیں۔ اس کے باپ کا چہرہ ہے، یا سہیں کا چہرہ ہے، اُس کے چہرے کا اور جسم کا چہرہ ہے پھر عینکوں والے خاک رکا چہرہ ہے جو بینٹ پر لکھتے ہوئے گشت کے ملکے کو دیکھتے ہی اُپنی اواز میں نظر لگاتا ہے؛ ”چور اچکنے پر دھرمی نے لندھی رن پر دھان۔“ مجھے میں سب لوگ اپنے عنکوں کا چہرے سنجیدگی سے بلا بلا کر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ گھبرا کر اٹھا ہیٹھا۔ وہ بازو پر سر رکھنے رکھنے سو گیا۔

جب اس نے انگلیوں کو لیں تو اسی خاں اُس کے اور پچھکا اُسے جگا رہا تھا۔ ”دو پھر ہو گئی ہے۔ چلو۔“ کہے

کافی نہ ہو پھر وہی تھا، صرف تیزین بچے اٹھ کر بُنی ماں کے گرد زیمن پر پاؤں کے بل بیٹھتے تھے۔ پھر سے جو تھڑدیں کی شکل میں آئے کے نیل سے آئے ہوئے جسموں پر لکھ رہے تھے اور وہ تھوں میں کمی کی زندگی کے نگارے تھامے آئیں بے خیال نے اداز میں چبارہے تھے اور دوفوں اخجیوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ دروازہ اسی طرح اندر سے بند تھا، کمرے میں روشنی ایک کھڑکی کے راستے داخل ہو رہی تھی جس کا صرف ایک پٹ کھلا تھا، پھر تھے پچھے کے اتحاد سے روٹ کا ٹھہر کر زیمن پر آتا، جسے اُس کی ماں نے اٹھا کر سختی سے دوبارہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”خیال سے کھا“ وہ پہلے مہماں پر، پھر اپنے خادم پر اپنی ہوتی تقدیر دال کرنے پچے کے سر کے اور پنکھوں میں دیکھتی ہوتی بولی، جب سے ہوا ہے ایک دن اس نے خیال سے روٹ نہیں کھائی۔
پھر رُنی کا ٹھہر کر پھر بے خیال سے اُس کا کنارا چلنے لگا۔ اسدے کرے کے کرنے میں جا کر تھوکا جہاں فرش میں پاپی کے انخلاء کے لیے موری نکلی تھی۔ آن کے نیز ماں نے مکنی کی ایک ایک روٹ اور گڑ کا ڈھیلا آن کے حوالے کیا جوانہوں نے اُوھا آدھا کھایا، باقی اپنی اپنی چادروں کے کوفوں میں بازدھ لیا۔ پھر عورت نے کیتی میں سے گرم چانے کا ایک ایک پیار بھر کر نہیں دیا۔ جب وہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو اُس وقت موچپور، والے آدمی نے پہلی، اور آخری بار (غایباً رہنی پیوی کے اکس نے پر) بات کی۔ یہ بات اس نے چند انفاذ اور ہاتھ کے مختصر اشاروں کی مرد سے ادا کی اور اس کا مدعا نہ کا ایک ٹکڑا حمل کرنے کی وظیافت تھی۔

امیر خاں نے چند لمحے تک سوچ کی تقدیر سے اُس کی طرف دیکھنے کے بعد اپنا نہ کا ڈھیلا کندھے سے اتارا، اُسے کرنے میں پرمی دُورہ کے کارے پر رکھا، اور ڈنڈا اٹھا کر اختیاط سے اُس کے ایک کونے پر مارا۔ صاف گلابی نہ کا پر جہاں ڈنڈے کی چوٹ پرمی دماں سے دب کر سفید ہو گیا اور اس نشان میں سے چھوٹی بُری سفیدی دھاریاں نکل کر نہ کی سطح پر بھیل گئیں۔ امیر خاں نے اتحاد رُک کر سفید پسی ہوئی سطح کا معائنہ کیا، جیسے اُس دانوں کا افسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے ڈنڈا اٹھا کر ذرا زور سے ڈھیلے پر مارا تو نہ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کر دئے کر دُورہ میں جا گرا۔ امیر خاں نے کرتے کے دام سے اپنے ڈھیلے کو اچھی طرح سے صاف کیا اور اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ دوفوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔ گھر کے نہ کا اسے دوڑاں سے سزا نکال کر دیں اور انہیں نظر دالی، پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سوچ مسر پر چھا اور میلے میلے پچھے، سوریہ میں اور مرد اپنے راستوں پر آجائے تھے۔

اندر اندر ہو گیا ہو گا، اسدے نے خیال کیا۔ اندر ہیرے کے کے اندر بے خیال میں روٹ کے